

○
تفسير القرآن

الواقعة

(٥٤)

الواقعة

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الواقعة کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | حضرت عبداللہ بن عباس نے سورتوں کی جو ترتیب نزول بیان کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورہ طہ نازل ہوئی، پھر الواقعة اور اس کے بعد الشعراء (الاتقان للشیوٹی)۔ یہی ترتیب بکرہ نے بھی بیان کی ہے (بیمتی، دلائل النبوة)۔

اس کی تائید اس قصہ سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمر انبی بنی کے گھر میں داخل ہوئے تو سورہ طہ پڑھی جا رہی تھی۔ اُن کی آہٹ سُن کر ان لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیے۔ حضرت عمر پہلے تو ہنسنے پر پل پڑے اور جب بنی اُن کو بچانے آئیں تو اُن کو بھی مارا بیان تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بنی کا خون بستے دیکھ کر حضرت عمر کو سخت ندامت ہوئی اور انہوں نے کہا، اچھا مجھے وہ صحفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپا لیا ہے۔ دیکھوں تو یہی اُس میں کیا لکھا ہے۔ بنی نے کہا "آپ اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہیں، دانہ لا یدسہا الا الطاہر" اس صحفہ کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے اٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحفہ کو لے کر پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُس وقت سورہ الواقعة نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اس میں آیت لا یدسہا الا الطاہر وارد ہوئی ہے۔ اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر نے ہجرت حبشہ کے بعد ۳۵ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفار مکہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب سے زیادہ جس چیز کو ناقابل یقین قرار دیتے تھے وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہوگی جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام دہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ جلا اٹھائے جائیں گے اور اُن کا محاسبہ ہوگا اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہ گار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اُن کا کتنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں جن کا عالم واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ کسی کی یہ طاقت ہوگی کہ اُسے آتے آتے روک دے، یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے۔ اُس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک، سابقین۔ دوسرے، عام صالحین۔ تیسرے وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور مرتے دم تک کفر و شرک اور گناہ کبیرہ پر جمے رہے۔ ان تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷ سے ۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آیت ۷ سے ۱۴ تک اسلام کے اُن دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے درپے

دلائل دیے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفار انکار کر رہے تھے، یعنی توحید اور آخرت۔ ان دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے دیے ہوئے سامانِ زیست پر پل رہا ہے اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی بجالانے کا آخر تجھے حق کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا عاجز و درماتندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لاسکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں اُن کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بد نصیبو، یہ عظیم الشان نعمت تمہارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصہ اس نعمت میں یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹی بے اعتنائی برتتے ہو۔ قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتہ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوقات کی دستِ رس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں، حالانکہ لوحِ محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعہ سے یہ پہنچتی ہے اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی لہن ترانیاں ہانکے اور اپنی خود مختاری کے گھمنڈ میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اندھا ہو جائے، مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اُس وقت تو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں بچا سکتا۔ اپنی اولاد کو نہیں بچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پشیمواؤں اور محبوب ترین لیڈروں کو نہیں بچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تو دیکھتا رہتا ہے مگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اوپر فرمانروا نہیں ہے اور تیرا یہ زعم درست ہے کہ دنیا میں بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے، تو کسی مرنے والے کی نکلتی ہوئی جان کو پٹا کیوں نہیں لانا؟ جس طرح تو اس معاملہ میں بے بس ہے اسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے، موت کے بعد بر مرنے والا اپنا انجام دیکھ کر رہے گا۔ مقررین میں سے ہو تو مقررین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا اور جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لیے مفقود ہے۔

آیاتها ۹۶

سُورَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۱ لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۲ خَافِضَةٌ
رَافِعَةٌ ۳ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۴ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ نہ تو
بالا کر دینے والی آفت ہوگی۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ

۱۔ اس فقرے سے کلام کا آغاز خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ان باتوں کا جواب ہے جو اُس وقت کفار کی مجلسوں
میں قیامت کے خلاف بنائی جا رہی تھیں۔ زمانہ وہ تھا جب مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نئی
نئی اسلام کی دعوت سن رہے تھے۔ اُس میں جو چیز انہیں سب سے زیادہ عجیب اور بعید از عقل و امکان نظر آتی تھی وہ یہ
تھی کہ ایک روز زمین و آسمان کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں سب
اگلے پچھلے مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات سُن کر حیرت سے اُن کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ
جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آخر یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ چاند، یہ سورج کہاں چلے جائیں
گے؟ صدیوں کے گڑے مُردے کیسے جی اٹھیں گے؟ مرنے کے بعد دوسری زندگی، اور پھر اُس میں بہشت کے باغ اور جہنم
کی آگ، آخر یہ خواب و خیال کی باتیں عقل و ہوش رکھتے ہوئے ہم کیسے مان لیں؟ یہی چہ میگوئیاں اُس وقت مکہ میں ہر جگہ
ہورہی تھیں۔ اس پس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی اُسے
جھٹلانے والا نہ ہوگا۔

اس ارشاد میں قیامت کے لیے ”واقعہ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جس کے لیے
اُردو زبان میں ہونی شدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں، یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آکر ہی رہنا ہے۔ پھر اس
کے پیش آنے کو ”وَقَعَتْ“ کہا گیا ہے جو عربی زبان میں کسی بڑے حادثہ کے اچانک برپا ہوجانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وقوع کا ٹل جانا اور اس کا آتے آتے ٹک جانا اور
اُس کی آمد کا پھیر دیا جانا ناممکن نہ ہوگا، یا بالفاظ دیگر کوئی طاقت پھر اُس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہوگی۔ دوسرے یہ
کہ کوئی متنفس اُس وقت یہ جھوٹ لہنے والا نہ ہوگا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

۲۔ اصل الفاظ ہیں خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ، ”گرانے والی اور اٹھانے والی“ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ

بِسَاءٍ ۱۰ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبِتًا ۱۱ وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا
ثَلَاثَةً ۱۲ فَاصْحَبُ الِیْمَنَةِ ۱۳ مَا اصْحَبُ الِیْمَنَةِ ۱۴
وَاصْحَبُ الشُّعْمَةِ ۱۵ مَا اصْحَبُ الشُّعْمَةِ ۱۶ وَالسَّابِقُونَ
السَّابِقُونَ ۱۷ اُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۱۸ فِی جَنَّتِ النَّعِیمِ ۱۹

کر دیے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔

تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے:

دائیں بازو والے، سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔

اور بائیں بازو والے، تو بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی) کا کیا ٹھکانا۔

اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرب لوگ ہیں نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔

وہ سب کچھ اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی نیچے کی چیزیں اوپر اور اوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے والی اور اٹھے ہوئے لوگوں کو گرانے والی ہوگی، یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزت و ذلت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہوگا۔ جو دنیا میں عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔

۱۳ یعنی وہ کوئی مقامی زلزلہ نہ ہوگا جو کسی محدود علاقے میں آئے، بلکہ پوری کی پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی۔ اُس کو ایک نخت ایک زبردست جھٹکا لگے گا جس سے وہ لڑ کر رہ جائے گی۔

۱۴ خطاب اگرچہ بظاہر اُن لوگوں سے ہے جنہیں یہ کلام سنایا جا رہا تھا، یا جو اب اسے پڑھیں یا سنیں، لیکن دراصل پوری نوع انسانی اس کی مخاطب ہے۔ تمام انسان جو اول روزِ آخرت میں سے قیامت تک پیدا ہوئے ہیں وہ سب آخر کار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

۱۵ اصل میں لفظ اصحاب الِیْمَنَةِ استعمال ہوا ہے۔ یْمَنَةُ عربی قاعدے کے مطابق یمن سے بھی ہو سکتا ہے

جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں، اور یْمَن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی میں فال نیک۔ اگر اس کو یمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب الِیْمَنَةِ کے معنی ہوں گے "سیدھے ہاتھ والے" لیکن اس سے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے عالی مرتبہ لوگ۔ اہل عرب سیدھے ہاتھ کو قوت اور رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ جس کا احترام مقصود ہوتا تھا اُسے

ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝ عَلٰی
سُرٍّ مَّوْضُوعَةٍ ۝ مُتَّكِبِينَ عَلَيْهَا مُتَّقِلِينَ ۝ يَطُوفُ

انگلوں میں سے بہت ہوں گے اور کھچلوں میں سے کم۔ مربع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔

مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے فلان صنی بالیصین، ”وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے“ اردو میں بھی کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دست راست اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کا خاص آدمی ہے۔ اور اگر اس کو یمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

۱۵ اصل میں لفظ اصحاب المشئمہ استعمال ہوا ہے۔ مشئمہ، شوم سے ہے جس کے معنی بد بختی، نحوست اور بد حالی کے ہیں۔ اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شومنی کہا جاتا ہے۔ اردو میں شومنی قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ اہل عرب شمال رہائیں ہاتھ اور شوم (فال بد) کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بائیں ہاتھ کمزوری اور ذلت کا نشان تھا۔ سفر کو جاتے ہوئے اگر پرندہ اڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف جاتا تو وہ اُس کو بُری فال سمجھتے تھے۔ کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اسے کمتر درجے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے ہاں اس کی کوئی عزت نہیں تو کہا جاتا کہ فلان صنی بالشمال، ”وہ میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے“ اردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پس اصحاب المشئمہ سے مراد ہیں بد بخت لوگ، یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت سے دوچار ہوں گے اور دربار الہی میں بائیں طرف کھڑے کیے جائیں گے۔

۱۶ سابقین (آگے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی اور حق پرستی میں سب پر سبقت لے گئے ہوں، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے ہوں، خدا اور رسول کی پکار پر سب سے پہلے تلبیک کہنے والے ہوں، جہاد کا معاملہ ہو یا اتفاق فی سبیل اللہ کا یا خدمتِ خلق کا یا دعوتِ خیر اور تبلیغِ حق کا، غرض دنیا میں بھلائی پھیلانے اور مڑائی مٹانے کے لیے ایشار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا جو موقع بھی پیش آئے اس میں وہی آگے بڑھ کر کام کرنے والے ہوں۔ اس بنا پر آخرت میں بھی سب سے آگے وہی رکھے جائیں گے۔ گویا وہاں اللہ تعالیٰ کے دربار کا نقشہ یہ ہو گا کہ دائیں بازو میں صالحین، بائیں بازو میں فاسقین، اور سب سے آگے بارگاہِ خداوندی کے قریب سابقین۔ حدیث میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا ”جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچ کر اللہ کے سایہ میں جگہ پائیں گے؟“ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے۔ فرمایا الذین اعطوا الحق قبلوہ، واذا سُئِلُوہ بذلِوہ، وحکموا للناس حکمہم لانفسہم، ”وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے

عَلَيْهِمْ وَلِدَانٌ فَتُحَدَّثُونَ ﴿۱۷﴾ يَا كُوفٍ وَابَارِئِقَهُ وَكَأْسٍ مِّنْ
مَّعِينٍ ﴿۱۸﴾ لَا يَصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُزْفُونَ ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ

ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شرابِ چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کُنڈرا اور ساغر لیے دوڑتے پھرتے
ہونگے جسے پی کر نہ ان کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔ اور وہ ان کے سامنے طرح طرح

حق پیش کیا گیا انہوں نے قبول کر لیا، جب ان سے حق مانگا گیا انہوں نے ادا کر دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں ان کا
فیصلہ وہی کچھ تھا جو خود اپنی ذات کے معاملہ میں تھا (مسند احمد)۔

۱۷ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اولین اور آخرین یعنی انگلوں اور پھلوں سے مراد کون ہیں۔
ایک گروہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جتنی امتیں گزری ہیں وہ اولین ہیں،
اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قیامت تک کے لوگ آخرین ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بعثت
معدی سے پہلے ہزار ہا برس کے دوران میں جتنے انسان گزرے ہیں ان کے سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور حضور کی بعثت کے
بعد سے قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے جو لوگ سابقین کا مرتبہ پائیں گے ان کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرا گروہ کتاب
کہ یہاں اولین و آخرین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولین و آخرین ہیں۔ یعنی آپ کی امت میں ابتدائی دور کے
لوگ اولین ہیں جن میں سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور بعد کے لوگ آخرین ہیں جن میں سابقین کی تعداد کم ہوگی۔ تیسرا گروہ
کتاب ہے کہ اس سے مراد برہمنی کی امت کے اولین و آخرین ہیں، یعنی برہمنی کے ابتدائی پیروؤں میں سابقین بہت ہونگے اور
بعد کے آنے والوں میں وہ کم پائے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ ان تینوں مضموموں کے حامل ہیں اور بعید نہیں کہ یہ تینوں ہی
صحیح ہوں، کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور مطلب بھی ان الفاظ سے نکلتا ہے اور
وہ بھی صحیح ہے کہ ہر پہلے دور میں انسانی آبادی کے اندر سابقین کا تناسب زیادہ ہوگا اور بعد کے دور میں ان کا تناسب کم
نکلے گا۔ اس لیے کہ انسانی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے، سبقت فی الخیرات کرنے والوں کی تعداد اسی رفتار سے نہیں
بڑھتی۔ گنتی کے اعتبار سے یہ لوگ چاہے پہلے دور کے سابقین سے تعداد میں زیادہ ہوں، لیکن بحیثیت مجموعی دنیا کی آبادی
کے مقابلے میں ان کا تناسب گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

۱۸ اس سے مراد ہیں ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، ان کی عمر ہمیشہ ایک ہی حالت پر ٹھہری رہے گی۔
حضرت علیؑ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اہل دنیا کے وہ بچے ہیں جو یالغ ہونے سے پہلے مر گئے، اس لیے نہ ان کی کچھ
نیکیاں ہونگی کہ ان کی جزا پائیں اور نہ بدیاں ہونگی کہ ان کی سزا پائیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سے مراد صرف وہی اہل دنیا ہو
سکتے ہیں جن کو جنت نصیب نہ ہوئی ہو۔ رہے مومنین صالحین، تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں یہ ضمانت دی
ہے کہ ان کی ذریت ان کے ساتھ جنت میں لاملاتی جائے گی (الطور، آیت ۲۱)۔ اسی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو

مِمَّا يَخْتَارُونَ ﴿۳۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۳۱﴾ وَحُورٍ عِينٍ ﴿۳۲﴾
 كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ﴿۳۳﴾ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۴﴾
 لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿۳۵﴾

کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں، اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں۔ اور ان کے لیے خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہونگی، ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی۔

ابوداؤد طیالسی، کبرانی اور کثار نے حضرت انس اور حضرت سمرہ بن جندب سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کے بچے اہل جنت کے خادم ہونگے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۶۔ جلد پنجم، الطور، حاشیہ ۱۹)۔

۱۱۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۷۔ جلد پنجم، سورہ محمد، حاشیہ ۲۲۔ الطور، حاشیہ ۱۸۔

۱۲۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ طور، حاشیہ ۱۷۔

۱۳۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۸۔ ۲۹۔ اللہ خان، حاشیہ ۲۲۔ جلد پنجم، الرحمن، حاشیہ ۵۱۔

۱۴۔ یہ جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے، جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، کہ انسان کے کان و باں، بیہودگی، یا وہ گوئی، جھوٹ، غیبت، چغلی، بتان، گالی، لات و گزاف، طنز و تمسخر اور طعن و تشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہوں گے۔ وہ بندگان اور بدتمیز لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کھوپڑا چھالیں۔ وہ شریف اور مہذب لوگوں کا معاشرہ ہوگا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہوں گی۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے کچھ بھی شائستگی اور مذاق سلیم سے نوازا ہو تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے انسان کو جنت میں نجات پانے کی امید دلائی گئی ہے۔

۱۵۔ اصل الفاظ ہیں اَلَا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا۔ بعض مفسرین و مترجمین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہاں ہر

وَاصْبُ الْيَمِينِ ۗ مَا اصْبُ الْيَمِينِ ۗ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۙ (۲۸)
 وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۙ (۲۹) وَظِلِّ مَّمْدُودٍ ۙ (۳۰) وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ۙ (۳۱)
 وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۙ (۳۲) لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ۙ (۳۳) وَفُرْنٍ
 مَّرْفُوعَةٍ ۙ (۳۴) إِنَّا أَنشَأْنَهُنَّ إِنشَاءً ۙ (۳۵) فَجَعَلْنَهُنَّ أَبْكَارًا ۙ (۳۶)

اور دائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیروں، اور
 تہ برتہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دُور تک پھیلی ہوئی چھاؤں، اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ
 ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں، اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔
 ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے،

طرف سلام سلام ہی کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہے قول سلیم، یعنی ایسی گفتگو جو عیوب
 کلام سے پاک ہو، جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو پچھلے فقرے میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں سلام کا لفظ قریب قریب اسی مفہوم
 میں استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے انگریزی میں لفظ Sahe استعمال ہوتا ہے۔

۱۵۱۵ یعنی ایسی بیویاں جن کے درختوں میں کانٹے نہ ہوں گے۔ ایک شخص تعجب کا اظہار کر سکتا ہے کہ ہر ایسا کونسا
 نفیس پھل ہے جس کے جنت میں ہونے کی خوشخبری سنائی جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنت کے بیروں کا تو کیا ذکر خود اس
 دنیا کے بھی بعض علاقوں میں یہ پھل اتنا لذیذ، خوشبودار اور میٹھا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اسے چھوڑنا
 مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پیر جنتی اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، ان کے درختوں میں کانٹے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے
 جنت کے بیروں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے درخت بالکل ہی کانٹوں سے خالی ہوں گے، یعنی ایسی بہترین قسم کے
 ہوں گے جو دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

۱۵۱۶ اصل الفاظ ہیں لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ۔ لا مقطوعہ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہوں گے کہ موسم
 گزر جانے کے بعد نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لیے جائیں تو ایک
 مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے، بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے، لگاتار پیدا ہوتا چلا جائے
 اور لامنتوعہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی، نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں
 کوئی امر مانع ہوگا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

۱۵۱۷ اس سے مراد دنیا کی وہ نیک خواتین ہیں جو اپنے ایمان و عمل صالح کی بنا پر جنت میں جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ

عَرَبًا أَتْرَابًا ۝۳۶ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ ۝۳۸ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأُولَىٰ ۝۳۹ وَ
ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝۴۰ وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ ۝۴۱ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ ۝۴۱
فِي سَمُوٰهُمْ وَحَبِيْمٍ ۝۴۲ وَظِلٌّ مِّنْ يَّحْمُومٍ ۝۴۳ لَا بَارِدٌ وَلَا كَرِيْمٍ ۝۴۴

اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن۔ یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لیے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پھیلوں میں سے بھی بہت۔

اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بد نصیبی کا کیا پوچھنا۔ وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ۔

ان سب کو وہاں جو ان بنا دے گا، خواہ وہ کتنی ہی بوڑھی ہو کر مری ہوں۔ نہایت خوبصورت بنا دے گا، خواہ دنیا میں وہ حبسین رہی ہوں یا نہ رہی ہوں۔ باکرہ بنا دیگا، خواہ دنیا میں وہ کنواری مری ہوں یا بال بچوں والی ہو کر۔ ان کے شوہر بھی اگر ان کے ساتھ جنت میں پہنچیں گے تو وہ ان سے ملا دی جائیں گی، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی اور جنتی سے ان کو بیاہ دیگا۔ اس آیت کی یہی تشریح متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بڑھیا نے حضور سے عرض کیا میرے حق میں جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہوگی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اُسے تباؤ، وہ بڑھیا پے کی حالت میں داخل جنت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انہیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور باکرہ بنا دیں گے۔ ابن ابی ساتم نے حضرت سلمہ بن زید کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے اس آیت کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا، "اس سے مراد دنیا کی عورتیں ہیں، خواہ وہ باکرہ مری ہوں یا شادی شدہ۔" طبرانی میں حضرت ام سلمہ کی ایک طویل روایت ہے جس میں وہ جنت کی عورتوں کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات کا مطلب حضور سے دریافت فرماتی ہیں۔

اس سلسلہ میں حضور اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ هُنَّ اللَّوَاتِي قَبِضْنَ فِي دَاوَالدُّنْيَا هَجَا تَزْس مَصَا شَمَطًا خَلَقْنَ اللّٰهُ بَعْدَ الْكَبْرِ فَجَمَلْنَ عَدَا سَىٰ۔ "یہ وہ عورتیں ہیں جو دنیا کی زندگی میں مری ہیں۔ بوڑھی پھونس، آنکھوں میں چھپر، سر کے بال سفید۔ اس بڑھیا پے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر سے باکرہ پیدا کر دے گا۔" حضرت ام سلمہ پوچھتی ہیں اگر کسی عورت کے دنیا میں کئی شوہر رہ چکے ہوں اور وہ سب جنت میں جائیں تو وہ ان میں سے کس کو ملے گی؟ حضور فرماتے ہیں انہا تَخَيَّرْتُمْ خَيْرًا حَسَنًا خَلَقًا فَتَقُولُ يَا رَبِّ اِنْ هَذَا كَانَ اِحْسَنَ خَلْقًا مَعِيَ فَزَوِّجْنِيهَا، يَا اَمْرَسَلِمَةَ، ذَهَبَ حَسَنَ الْخَلْقِ بِخَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ "اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جسے چاہے چن لے، اور وہ اُس شخص کو چننے کی جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا تھا سو وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ اُسے رب،

إِنَّكُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ ﴿۳۵﴾ وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى
الْحِنْتِ الْعَظِيمِ ﴿۳۶﴾ وَكَانُوا يَقُولُونَ ۚ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا
وَعِظَامًا ۖ إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۳۷﴾ أَوْ آبَاءُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿۳۸﴾ قُلْ إِنَّ
الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿۳۹﴾ لَمَجْمُوعُونَ ۚ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ

یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہِ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔
کہتے تھے ”کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پتھر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیسے
جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟“ اے نبی! ان
لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے روز پھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر

اس کا برتاؤ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا اس لیے مجھے اسی کی بیوی بنا دے۔ اے ام سلمہ، حسن اخلاق دنیا اور آخرت
کی ساری بھلائی لوٹ لے گیا ہے۔“ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ رحمن، حاشیہ ۵۱)۔
۱۵۸ اصل میں لفظ عَصْرًا بآ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لیے بولا

جاتا ہے۔ اس سے مراد ایسی عورت ہے جو طہارت، خوش اطوار ہو، خوش گفتار ہو، نسوانی جذبات سے لبریز ہو، اپنے
شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

۱۵۹ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہوں گی۔ دوسرا یہ کہ وہ آپس میں ہم سن
ہوں گی، یعنی تمام جنتی عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں گی اور ہمیشہ اسی عمر کی رہیں گی۔ بعید نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں بیک وقت
صحیح ہوں، یعنی یہ عورتیں خود بھی ہم سن ہوں اور ان کے شوہر بھی ان کے ہم سن بنا دیے جائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ
يَدْخُلُ أَهْلَ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ جُودًا ۖ هَرْدًا ۖ بَيْضًا ۖ جَعَادًا ۖ كَعَلْبِينَ ۖ أَبْنَاءَ ثَلَاثِثًا ۖ وَثَلَاثِينَ ۖ اِبِلْ جَنَّةٍ ۖ حَبِ جَنَّةٍ ۖ فِيهَا
وَإِخْلُ هُوْنَ كَعِ نُوَانِ كَعِ جِمْ بَالُوْنَ سَعِ صَافِ هُوْنَ كَعِ ۖ نَسِيْنَ بَهِيْكَ رَهِيْ هُوْنَ كِيْ مَكْرُثَا رَهِيْ نَهْ نَكْلِيْ هُوْكَ ۖ كُوْرَسَعِ چُطْ هُوْنَ كَعِ
كَعِطْ هُوْرَسَعِ بَدَنِ هُوْنَ كَعِ ۖ اَنْكَبِيْنَ سَرْكَبِيْنَ هُوْنَ كَعِ ۖ سَبْ كِيْ عَمُوْسِ ۲۲ سَالِ كِيْ هُوْنَ كِيْ ۖ اَرْمُسْدَا ۖ حَمْدَا ۖ مَرْوِيَاتِ ۖ اَبِيْ بَرْزَخِ ۖ ۖ
قَرِيْبِ قَرِيْبِ هِيْ مَضْمُونِ تَرْبِزِيْ ۖ فِيْهَا حَضْرَتِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ۖ وَحَضْرَتِ ابُو سَعِيْدٍ خَدْرَجِيْ ۖ سَعِيْ مَرْوِي ۖ ۖ

۱۶۰ یعنی خوشحال نے ان پر اٹا اثر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ اٹے کا فر نعمت ہو گئے

تھے۔ اپنی لذاتِ نفس میں منہمک ہو کر خدا کو بھولی گئے تھے۔ اور گناہِ عظیم پر مصر تھے ”گناہِ عظیم“ کا لفظ جامع ہے۔ اس

سے مراد کفر و شرک اور دہریت بھی ہے اور اخلاق و اعمال کا ہر بڑا گناہ بھی۔

مَعْلُومٍ ۵۰ ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيْهَا الضَّالُّونَ الْمُكْذِبُونَ ۵۱ لَا تَكُونُوا
 مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُومٍ ۵۲ فَبَالِغُونَ فِيهَا الضُّلُوعَ ۵۳ فَشَرِبُوا مِنْهُ
 عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ۵۴ فَشَرِبُوا مِنْ شَرَابِ الْهَيْمِ ۵۵ هَذَا نُزْلُهُمْ
 يَوْمَ الدِّينِ ۵۶ نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا نَصْرًا قُونًا ۵۷ أَفَرَأَيْتُمْ
 مَا تَمْنُونَ ۵۸ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ۵۹ نَحْنُ

کیا جا چکا ہے۔ پھر اسے گرا ہوا اور جھٹلانے والا، تم شجر زقوم کی غذا کھانے والے ہو۔ اسی سے
 تم پیٹ بھر و گے اور اوپر سے کھوتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے
 بائیں والوں کی ضیافت کا سامان روزِ جزا میں۔

ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ
 جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے

۵۱ زقوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۴۔

۵۲ بیان سے آیت ۲۴ تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں بیک وقت آخرت اور توجید، دونوں پر استدلال
 کیا گیا ہے۔ چونکہ مکہ کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ان دونوں بنیادی اجزاء پر معترض تھے اس لیے یہاں دلائل
 اس انداز سے دیے گئے ہیں کہ آخرت کا ثبوت بھی ان سے ملتا ہے اور توجید کی صداقت کا بھی۔

۵۳ یعنی اس بات کی تصدیق کہ ہم ہی تمہارے رب اور معبود ہیں، اور ہم تمہیں دوبارہ بھی پیدا
 کر سکتے ہیں۔

۵۴ اس مختصر فقرے میں ایک بڑا اہم سوال انسان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری چیزوں
 کو چھوڑ کر انسان اگر صرف اسی ایک بات پر غور کرے کہ وہ خود کس طرح پیدا ہوا ہے تو اسے نہ قرآن کی تعلیم توجید میں
 کوئی شک رہ سکتا ہے نہ اس کی تعلیم آخرت میں۔ انسان آخر اسی طرح تو پیدا ہوتا ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے رحم تک
 پہنچا دیتا ہے۔ مگر کیا اس نطفہ میں بچہ پیدا کرنے کی، اور لازماً انسان ہی کا بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت آپ سے آپ پیدا
 ہو گئی ہے؟ یا انسان نے خود پیدا کی ہے؟ یا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کر دی ہے؟ اور کیا یہ مرد کے، یا عورت کے، یا دنیا
 کی کسی طاقت کے اختیار میں ہے کہ اس نطفے سے حمل کا استقرار کرادے؟ پھر استقرارِ حمل سے وضعِ حمل تک ماں کے پیٹ

قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۶۰﴾ عَلَى
 أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۶۱﴾
 وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۶۲﴾

تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدلیں
 اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو،
 پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟

میں بچنے کی درجہ بدرجہ تخلیق و پرورش، اور ہر بچنے کی الگ صورت گری، اور ہر بچنے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو
 ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک خاص شخصیت کا انسان بن کر اٹھے، کیا یہ سب کچھ ایک خدا کے سوا کسی
 اور کا کام ہے؟ کیا اس میں کسی اور کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل ہے؟ کیا یہ کام ماں باپ خود کرتے ہیں؟ یا کوئی ڈاکٹر کرتا ہے؟ یا وہ
 انبیاء اور اولیاء کرتے ہیں جو خود اسی طرح پیدا ہوئے ہیں؟ یا سوچ اور چاند اور تارے کرتے ہیں جو خود ایک قانون کے غلام
 ہیں؟ یا وہ فطرت (Nature) کرتی ہے جو بچائے خود کوئی علم، حکمت، ارادہ اور اختیار نہیں رکھتی؟ پھر کیا یہ فیصلہ
 کرنا بھی خدا کے سوا کسی کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو یا لڑکا؟ خوبصورت ہو یا بد صورت؟ طاقتور ہو یا کمزور؟ اندھا
 بہر انکڑا ٹولا ہو یا صحیح الاعضاء؟ ذہین ہو یا کند ذہن؟ پھر کیا خدا کے سوا کوئی اور یہ طے کرتا ہے کہ قوموں کی تاریخ میں کس
 وقت کس قوم کے اندر کن اچھی یا بُری صلاحیتوں کے آدمی پیدا کرے جو اُسے عروج پر لے جائیں یا زوال کی طرف دھکیل
 دیں؟ اگر کوئی شخص خدا اور ہٹ دھرمی میں مبتلا نہ ہو تو وہ خود محسوس کرے گا کہ شرک یا دہریت کی بنیاد پر ان سوالات
 کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا۔ ان کا معقول جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پورا کاپورا خدا کا ساختہ
 و پر داختہ ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے ساختہ و پر داختہ اس انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خالق کے مقابلے
 میں آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے؟ یا اُس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بجالائے؟

توحید کی طرح یہ سوال آخرت کے معاملہ میں بھی فیصلہ کن ہے۔ انسان کی تخلیق ایک ایسے کیڑے سے ہوتی ہے جو
 طاقتور خوردبین کے بغیر نظر تک نہیں آسکتا۔ یہ کیڑا عورت کے جسم کی تاریکیوں میں کسی وقت اُس نسوانی انڈے سے جا
 ملتا ہے جو اسی کی طرح ایک حقیر سا خوردبینی وجود ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خلیہ
 (Cell) بن جاتا ہے جو حیات انسانی کا نقطہ آغاز ہے، اور یہ خلیہ بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر اس کو نہیں
 دیکھا جاسکتا۔ اس ذرا سے خلیے کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ ۹ مہینے چند روز کے اندر رحم مادر میں ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتا ہے،
 اور جب اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو ماں کا جسم خوردبینی اسے دھکیل کر دنیا میں اُدھم مچانے کے لیے باہر پھینک دیتا ہے۔

تمام انسان اسی طرح دنیا میں آئے ہیں اور شب و روز اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیدائش کا یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک غفل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اس طرح انسانوں کو آج پیدا کر رہا ہے وہ کل کسی وقت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے ان انسانوں کو دوبارہ کسی اور طرح پیدا نہ کر سکے گا۔

۵۲۵ یعنی تمہاری پیدائش کی طرح تمہاری موت بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم یہ طے کرتے ہیں کہ کس کو ماں کے پیٹ ہی میں مرجانا ہے، اور کسے پیدا ہوتے ہی مرجانا ہے، اور کسے کس عمر تک پہنچ کر مرنا ہے۔ جس کی موت کا جو وقت ہم نے مقدر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی، اور اس کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر خود بھی اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو جان سکا ہے، نہ آتی ہوئی موت کو روک سکا ہے، نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعہ سے، کہاں، کس طرح واقع ہونے والی ہے۔

۵۲۶ یعنی جس طرح ہم اس سے عاجز نہ تھے کہ تمہیں تمہاری موجودہ شکل و ہیئت میں پیدا کریں، اسی طرح ہم اس سے بھی عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری تخلیق کا طریقہ بدل کر کسی اور شکل و ہیئت میں، کچھ دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ تم کو پیدا کر دیں۔ آج تم کو ہم اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ تمہارا لطفہ قرار پاتا ہے اور تمہاں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ بن کر ایک بچہ کی صورت میں برآمد ہونے ہو۔ یہ طریق تخلیق بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر ہمارے پاس بس یہی ایک لگاؤ کا طریقہ نہیں ہے جس کے سوا ہم کوئی اور طریقہ نہ جانتے ہوں، یا نہ عمل میں لاسکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم تمہیں اسی عمر کے انسان کی شکل میں پیدا کر سکتے ہیں جس عمر میں تم مرے تھے۔ آج تمہاری بینائی، سماعت اور دوسرے حواس کا پیمانہ ہم نے کچھ اور رکھا ہے۔ مگر ہمارے پاس انسان کے لیے بس یہی ایک پیمانہ نہیں ہے جسے ہم بدل نہ سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم اُسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیں گے یہاں تک کہ تم وہ کچھ دیکھ اور سن سکو گے جو یہاں نہیں دیکھ سکتے اور نہیں سن سکتے۔ آج تمہاری کھال اور تمہارے ہاتھ پاؤں اور تمہاری آنکھوں میں کوئی گوریائی نہیں ہے۔ مگر زبان کو بولنے کی طاقت ہم ہی نے تو دی ہے۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے روز تمہارا ہر عضو اور تمہارے جسم کی کھال کا ہر ٹکڑا ہمارے حکم سے بولنے لگے۔ آج تم ایک خاص عمر تک ہی جیتے ہو اور اس کے بعد مر جاتے ہو۔ یہ تمہارا جینا اور مرنا بھی ہمارے ہی مقرر کردہ ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کل ہم ایک دوسرا قانون تمہاری زندگی کے لیے بنا سکتے ہیں جس کے تحت تمہیں کبھی موت نہ آئے۔ آج تم ایک خاص حد تک ہی عذاب برداشت کر سکتے ہو، جس سے زائد عذاب اگر تمہیں دیا جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضابطہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ کل ہم تمہارے لیے ایک دوسرا ضابطہ بنا سکتے ہیں جس کے تحت تم ایسا عذاب ایسی طویل مدت تک بھگت سکو گے جس کا تم تصور تک نہیں کر سکتے، اور کسی سخت سے سخت عذاب سے بھی تمہیں موت نہ آئے گی۔ آج تم سوچ نہیں سکتے کہ کوئی بوڑھا جوان ہو جائے کبھی بیمار نہ ہو، کبھی اُس پر بوڑھا پانا نہ آئے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ ایک ہی عمر کا جوان رہے۔ مگر یہاں جوانی پر بوڑھا پانا ہمارے بنائے ہوئے قوانین حیات ہی کے مطابق تو آتا ہے۔ کل ہم تمہاری زندگی کے لیے کچھ دوسرے قوانین بنا سکتے ہیں جن کے

اَفَرَأَيْتُمْ مَا كَسَّرْتُونُ ﴿۲۳﴾ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهُ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ﴿۲۴﴾

کبھی تم نے سوچا، بیج جو تم بوتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟

مطابق جنت میں جاتے ہی ہر بوڑھا جوان ہو جائے اور اس کی جوانی و تندرستی لازوال ہو۔

۲۳ یعنی تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے۔ کس طرح باپ کی صلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے۔ کس طرح رحم مادر میں، جو قبر سے کچھ کم تاریک نہ تھا، تمہیں پرورش کر کے زندہ انسان بنایا گیا۔ کس طرح ایک ذرہ بے مقدار کو نشوونما دے کر یہ دل و دماغ، یہ آنکھ کان اور یہ ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے اور عقل و شعور، علم و حکمت، صنعت و ایجاد اور تندہ و تیزی کی یہ سمیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ کیا یہ معجزہ مردوں کو دوبارہ جلا اٹھانے سے کچھ کم عجیب ہے؟ اس عجیب معجزے کو جب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خود اس کی زندہ شہادت کے طور پر دنیا میں موجود ہو تو کیوں اس سے یہ سبق نہیں لیتے کہ جس خدا کی قدرت سے یہ معجزہ شب و روز و نما ہو رہا ہے اسی کی قدرت سے زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا معجزہ بھی رونما ہو سکتا ہے؟

۲۴ اوپر کا سوال لوگوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساختہ و پرورشیتے ہو اور اسی کی تخلیق سے وجود میں آئے ہو۔ اب یہ دوسرا سوال انہیں اس دوسری اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جس رزق پر تم پلتے ہو وہ بھی اللہ ہی تمہارے لیے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح تمہاری پیدائش میں انسانی کوشش کا دخل اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کے اندر نطفہ ڈال دے، اسی طرح تمہارے رزق کی پیداوار میں بھی انسان کی کوشش کا دخل اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ کسان کھیتی میں بیج ڈال دے۔ زمین، جس میں یہ کاشت کی جاتی ہے، تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس زمین کو روئیدگی کی صلاحیت تم نے نہیں بخشی ہے۔ اس میں وہ مادے جن سے تمہاری غذا کا سامان ہم پہنچتا ہے، تم نے فراہم نہیں کیے ہیں۔ اس کے اندر جو بیج تم ڈالتے ہو ان کو نشوونما کے قابل تم نے نہیں بنایا ہے۔ ان بیجوں میں یہ صلاحیت کہ بیج سے اسی نوع کا درخت پھوٹے جس کا وہ بیج ہے، تم نے پیدا نہیں کی ہے۔ اس کاشت کو لہلہاتی کھیتوں میں تبدیل کرنے کے لیے زمین کے اندر جس عمل اور زمین کے اوپر جس ہوا، پانی، حرارت، برودت اور موسمی کیفیت کی ضرورت ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی تمہاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت اور اسی کی پروردگاری کا کرشمہ ہے۔ پھر جب تم وجود میں اسی کے لانے سے آئے ہو، اور اسی کے رزق سے پل رہے ہو، تو تم کو اس کے مقابلہ میں خود مختاری کا، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا حق آخر کیسے پہنچتا ہے؟

اس آیت کا ظاہر استدلال تو توحید کے حق میں ہے، مگر اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس پر اگر آدمی غور و تأمل سے غور کرے تو اسی کے اندر آخرت کی دلیل بھی مل جاتی ہے۔ جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مردہ ہوتا ہے، مگر زمین کی قبر میں جب کسان اُس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اندر وہ باقی زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے کونپلیں

لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿٦٥﴾ إِنَّا
 لَمَغْرَمُونَ ﴿٦٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٦٧﴾ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ
 الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ
 الْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾

ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی
 چٹھی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔

کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم نے بادل سے برسیا ہے یا اس کے
 برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟

پھوٹی ہیں اور لعلاتی ہوئی کھیتیاں شان بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مردے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے
 جی جی کراٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اُس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے جس کی خبر قرآن
 ہمیں دے رہا ہے، یعنی انسانوں کی زندگی بعد موت۔

۵۲۹ یعنی تمہاری بھوک مٹانے ہی کا نہیں، تمہاری پیاس بجھانے کا انتظام بھی ہمارا ہی کیا ہوا ہے۔ یہ پانی جو تمہاری
 زندگی کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضروری ہے، تمہارا اپنا فراہم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اسے ہم فراہم کرتے ہیں۔ زمین میں یہ سمندر
 ہم نے پیدا کیے ہیں۔ ہمارے سورج کی گرمی سے اُن کا پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے۔ ہم نے اُس پانی میں یہ خاصیت پیدا کی ہے
 کہ ایک خاص درجہ حرارت پر وہ بھاپ میں تبدیل ہو جائے۔ ہماری ہوا میں اسے لے کر اٹھتی ہیں۔ ہماری قدرت اور حکمت
 سے وہ بھاپ جمع ہو کر بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے حکم سے یہ بادل ایک خاص تناسب سے تقسیم ہو کر زمین کے
 مختلف خطوں پر پھیلتے ہیں تاکہ جس خطہ زمین کے لیے پانی کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے وہ اُس کو پہنچ جائے۔ اور ہم بالائی
 فضا میں وہ برودت پیدا کرتے ہیں جس سے یہ بھاپ پھر سے پانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ ہم تمہیں صرف وجود میں لا کر ہی
 نہیں رہ گئے ہیں بلکہ تمہاری پرورش کے یہ سارے انتظامات بھی ہم کر رہے ہیں جن کے بغیر تم جی نہیں سکتے پھر ہماری
 تخلیق سے وجود میں آکر، ہمارا رزق کھا کر اور ہمارا پانی پی کر یہ حق تمہیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہمارے مقابلہ میں خود مختار
 بنو، یا ہمارے سوا کسی اور کی بندگی بجالاؤ؟

۵۳۰ اس نقرے میں اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ
 نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں، ان میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کتنی ہی چیزیں تحلیل ہو جائیں جب

أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿۴۱﴾ أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمُ شَجَرَهَا مِمَّنْ
نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ﴿۴۲﴾ فَنَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذَكُّرًا وَرَمَاقًا لِلْمُقْوِينَ ﴿۴۳﴾

کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے
پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامان
زیست بنایا ہے۔

وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے اور صرف اپنے اصل آبی اجزاء
کو لے کر ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں
شامل رہنیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اٹھتیں ان
میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام روئے زمین کو زمین شور بنا دیتی۔ نہ انسان اس پانی کو پی کر جی سکتا تھا،
نہ کسی قسم کی نباتات اس سے آگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی بھی عقل رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ
اندھی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ حکیمانہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت، جس کی بدولت کھاری سمندروں سے
صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر بارش کی شکل میں برستا ہے اور پھر دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں آبِ رسائی و آبِ شہ
کی خدمت انجام دیتا ہے، اس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ ودیعت کرنے والے نے پانی میں اس کو خوب سوچ
سمجھ کر بالکل ارادہ اس مقصد کے لیے ودیعت کیا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری
پانی سے پرورش پاسکتی تھی وہ اس نے سمندر میں پیدا کی اور وہاں وہ خوب جی رہی ہے۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا
میں پیدا کیا تھا اس کی پرورش کے لیے میٹھا پانی درکار تھا اور اس کی فراہمی کے لیے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے
پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اڑے جو اس کے اندر تحلیل ہو گئی ہو۔
۱۳۱۔ بالفاظ دیگر کیوں یہ کفرانِ نعمت کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی اس بارش کو دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتا ہے، اور کوئی یہ
خیال کرتا ہے کہ سمندر سے بادلوں کا اٹھنا اور پھر آسمان سے پانی بن کر برسنا ایک فطری چکر ہے جو آپ سے آپ چلے جا رہا ہے،
اور کوئی اسے خدا کی رحمت سمجھتا بھی ہے تو اس خدا کا اپنے اوپر یہ حق نہیں مانتا کہ اسی کے آگے سراطاعت جھکائے؟ خدا کی
انتہی بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہو اور پھر جواب میں کفر و شرک اور فسق و نافرمانی کرتے ہو؟

۱۳۲۔ درخت سے مراد یا تو وہ درخت ہیں جن سے آگ جلانے کے لیے لکڑی فراہم ہوتی ہے، یا نرغ اور
عقار نامی وہ دو درخت ہیں جن کی بری بھری ٹہنیوں کو ایک دوسرے پر مار کر قدیم زمانے میں اہل عرب آگ جھاڑا
کرتے تھے۔

۱۳۳۔ اس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ہر وقت روشن ہو کر انسان کو اس

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۞۴۳ فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ
النُّجُومِ ۞۴۴ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۞۴۵ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ
كَرِيمٌ ۞۴۶ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۞۴۷ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۞۴۸

پس اے نبی! اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے، کہ یہ
ایک بلند پایہ قرآن ہے، ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔

کاجھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے مختلف نہ ہو سکتی۔ آگ ہی سے انسان
نے حیوانات کی طرح کچی غذائیں کھانے کے بجائے ان کو پکا کر کھانا شروع کیا اور پھر اس کے لیے صنعت و ایجاد کے نئے
نئے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا وہ ذرائع پیدا نہ کرتا جن سے آگ جلائی جاسکے، اور وہ آتش پذیر یا دے
پیدا نہ کرتا جو آگ سے جل سکیں، تو انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا قفل ہی نہ کھلتا۔ مگر انسان یہ بات فراموش کر گیا ہے کہ
اُس کا خالق کوئی پروردگار حکیم ہے جس نے اُسے ایک طرف انسانی قابلیتیں دے کر پیدا کیا تو دوسری طرف زمین میں
وہ سروسامان بھی پیدا کر دیا جس سے اُس کی یہ قابلیتیں رُو بعمل آسکیں۔ وہ اگر غفلت میں مدہوش نہ ہو تو نہ تو آگ ہی
اسے یہ یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کس کے احسانات اور کس کی نعمتیں ہیں جن سے وہ دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔

۵۳۴ اصل میں لفظ مَقُونِ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف معنی اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ بعض اسے
صحرا میں اترے ہوئے مسافروں کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض اس کے معنی بھوکے آدمی کے لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک
اس سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خواہ وہ کھانا پکانے کا فائدہ ہو یا روشنی کا یا پیش کا۔

۵۳۵ یعنی اُس کا مبارک نام لے کر یہ اظہار و اعلان کرو کہ وہ اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے
پاک ہے جو کفار و مشرکین اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو کفر و شرک کے ہر عقیدے اور منکر بن آخرت کے
ہر استدلال میں معصوم ہیں۔

۵۳۶ یعنی بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ یہاں قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر قسم کھانے سے پہلے
لفظ لا کا استعمال خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ لوگ اس کتاب پاک کے متعلق کچھ باتیں بنا رہے تھے جن کی تردید کرنے کے لیے
یہ قسم کھائی جا رہی ہے۔

۵۳۷ تاروں اور سیاروں کے مواقع سے مراد اُن کے مقامات، اُن کی منزلیں اور اُن کے مدار ہیں۔ اور قرآن کے بلند
پایہ کتاب ہونے پر اُن کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ عالم بالا میں اجرام فلکی کا نظام جیسا محکم اور مضبوط ہے ویسا ہی مضبوط

اور محکم یہ کلام بھی ہے۔ جس خدا نے وہ نظام بنایا ہے اسی خدا نے یہ کلام بھی نازل کیا ہے۔ کائنات کی بے شمار کمکشانوں (Galaxies) اور ان کمکشانوں کے اندر بے حد و حساب تاروں (Stars) اور سیاروں (Planets) میں جو کمال درجہ کاربط و نظم قائم ہے، درآنحالیکہ بظاہر وہ بالکل بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی ایک کمال درجہ کامرابط و منظم ضابطہ حیات پیش کرتی ہے جس میں عقائد کی بنیاد پر اخلاق، عبادات، تعذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، قانون و عدالت، صلح و جنگ، غرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں، اور ان میں کوئی چیز کسی دوسری چیز سے بے جوڑ نہیں ہے، درآنحالیکہ یہ نظام فکر متفرق آیات اور مختلف مواقع پر دیے ہوئے خطبوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح خدا کے ہاند سے ہوئے عالم بالا کا نظم اٹل ہے جس میں کبھی قدرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا، اسی طرح اس کتاب میں بھی جو حقائق بیان کیے گئے ہیں اور ہدایات دی گئی ہیں وہ بھی اٹل ہیں، ان کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاسکتا۔

۵۳۸ اس سے مراد ہے کہ جو محفوظ اس کے لیے کتاب مکشونہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ایسا نوشتہ جو چھپا کر رکھا گیا ہے، یعنی جس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ اس محفوظ نوشتے میں قرآن کے ثبت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیے جانے سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس نوشتہ تقدیر میں ثبت ہو چکا ہے جس کے اندر کسی تبد و بدل کا امکان نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر مخلوق کی دست رس سے بالاتر ہے۔

۵۳۹ یہ تردید ہے کہ ان الزامات کی جو وہ قرآن پر لگایا کرتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاہن قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کلام آپ پر جن اور شیاطین القا کرتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ شعراء میں ارشاد ہوا ہے وَمَا تَنزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ، وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَظِيلُونَ اَنْ يَّهْرُوعِنَ السَّمْعِ لَمَعْنٍ وَّوُؤُنَ۔ اس کو لے کر شیاطین نہیں اترے ہیں، نہ یہ کلام ان کو سنا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔ (آیات ۲۱-۲۱ تا ۲۱)۔ اسی مضمون کو یہاں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "اسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا" یعنی شیاطین کا اسے لانا، یا اس کے نزول کے وقت اس میں دخل انداز ہونا تو درکنار، جس وقت یہ لوح محفوظ سے نبی پر نازل کیا جاتا ہے اس وقت مطہرین، یعنی پاک فرشتوں کے سوا کوئی قریب پھٹک بھی نہیں سکتا۔ فرشتوں کے لیے مطہرین کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کے ناپاک جذبات اور خواہشات سے پاک رکھا ہے۔

اس آیت کی یہی تفسیر انس بن مالک، ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، ابوالحالیہ، سیدی، ضحاک اور ابن زید نے بیان کی ہے، اور نظم کلام کے ساتھ بھی یہی مناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ سلسلہ کلام خود یہ بتا رہا ہے کہ توحید اور آخرت کے متعلق کفار مکہ کے غلط تصورات کی تردید کرنے کے بعد اب قرآن مجید کے بارے میں ان کے جھوٹے گمانوں کی تردید کی جا رہی ہے اور مواقع نجوم کی قسم کھا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے، اللہ تعالیٰ کے محفوظ نوشتے میں ثبت ہے جس میں کسی مخلوق کی دراندازی کا کوئی امکان نہیں، اور نبی پر یہ ایسے طریقے سے نازل ہوتی ہے کہ

پاکیزہ فرشتوں کے سوا کوئی اسے چھو تک نہیں سکتا۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں لا کو نفی کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کوئی ایسا شخص اسے نہ چھوئے جو پاک نہ ہو یا کسی ایسے شخص کو اسے نہ چھو نا چاہیے جو ناپاک ہو۔ اور بعض دوسرے مفسرین اگرچہ لا کو نفی کے معنی میں لیتے ہیں اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "اس کتاب کو مطہرین کے سوا کوئی نہیں چھو تا، مگر ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ نفی اسی طرح ہی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ المسلمون آخو المسلم لا یظلمہ (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا)۔ اس میں اگرچہ خبر دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان پر ظلم نہیں کرتا، لیکن دراصل اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ مسلمان مسلمان پر ظلم نہ کرے۔ اسی طرح اس آیت میں اگرچہ فرمایا گیا ہے کہ پاک لوگوں کے سوا قرآن کو کوئی نہیں چھو تا، مگر اس سے حکم یہ نکلتا ہے کہ جب تک کوئی شخص پاک نہ ہو، وہ اس کو نہ چھوئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر آیت کے سیاق و سباق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے تو اس کے الفاظ سے یہ مطلب نکالا جاسکتا ہے، مگر جس سلسلہ کلام میں یہ وارد ہوئی ہے اس میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع نظر نہیں آتا کہ "اس کتاب کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہ چھوئے" کیونکہ یہاں تو کفار مخاطب ہیں اور ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اللہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے، اس کے بارے میں تمہارا یہ گمان قطعی غلط ہے کہ اسے شیاطین ہی پر القا کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ شرعی حکم بیان کرنے کا آخر کیا موقع ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص طہارت کے بغیر اس کو ہاتھ نہ لگائے؟ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ آیت یہ حکم دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے مگر فحوائض کلام اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کتاب کو صرف مطہرین ہی چھو سکتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی کم از کم وہ لوگ جو اس کے کلام الہی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، اسے ناپاکی کی حالت میں چھونے سے اجتناب کریں۔

اس مسئلے میں جو روایات ملتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) امام مالک نے مؤطا میں عبد اللہ بن ابی بکر محمد بن عمرو بن حزم کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تحریری احکام عمرو بن حزم کے ہاتھ میں کے رو سا کو لکھ کر بھیجے تھے ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ لا یتسوا القرآن الا طاهر (کوئی شخص قرآن کو نہ چھوئے مگر طاهر یہی بات ابو داؤد نے سراسیل میں امام زہری سے نقل کی ہے کہ انہوں نے ابو بکر محمد بن عمرو بن حزم کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تحریر دیکھی تھی اس میں یہ حکم بھی تھا۔

(۲) حضرت علیؓ کی روایت، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یجوزہ عن القرآن شیء لیس الجنابة۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی چیز قرآن کی تلاوت سے نہ روکتی تھی سوا جنابت کے" (ابو داؤد، نسائی، ترمذی)۔

(۳) ابن عمرؓ کی روایت، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تقرأ الحائض

والجانب شيئاً من القرآن - مائتہ اور چُنٹی قرآن کا کوئی حصہ نہ پڑھے (ابوداؤد - ترمذی)۔

(۴) بخاری کی روایت، جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم ہرقل کو جو نامہ مبارک بھیجا تھا اس میں قرآن مجید کی یہ آیت بھی لکھی ہوئی تھی کہ يَا هَلْ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ.....

صحابہ و تابعین سے اس مسئلے میں جو مسالک منقول ہیں وہ یہ ہیں:

حضرت سلمان فارسی وضو کے بغیر قرآن پڑھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، مگر ان کے نزدیک اس حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہ تھا۔ یہی مسلک حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر کا بھی تھا اور حضرت حسن بصری اور ابراہیم شمعنی بھی وضو کے بغیر مصحف کو ہاتھ لگانا مکروہ سمجھتے تھے (احکام القرآن للبخاری)۔ عطاء اور طاؤس اور شعبی اور قاسم بن محمد سے بھی یہی بات منقول ہے (المغنی لابن قدامہ)۔ البتہ قرآن کو ہاتھ لگاٹے بغیر اس میں دیکھ کر پڑھنا، یا اس کو یاد سے پڑھنا ان سب کے نزدیک بے وضو بھی جائز تھا۔

جناب اور حیف و نفاس کی حالت میں قرآن پڑھنا حضرت عمر، حضرت علی، حضرت حسن بصری، حضرت ابراہیم نخعی اور امام زہری کے نزدیک مکروہ تھا۔ مگر ابن عباس کی رائے یہ تھی اور اسی پر ان کا عمل بھی تھا کہ قرآن کا جو حصہ پڑھنا آدمی کا معمولی بہوہ اسے یاد سے پڑھ سکتا ہے۔ حضرت سعید بن المسیب اور سعید بن جبیر سے اس مسئلے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، کہا قرآن اس کے حافظہ میں محفوظ نہیں ہے؟ پھر اس کے پڑھنے میں کیا حرج ہے؟ (المغنی)۔ اور المصنف لابن حزم)۔

فقہاء کے مسالک اس مسئلے میں حسب ذیل ہیں:

مسلم حنفی کی تشریح امام علاء الدین الکاشانی نے بدائع الصنائع میں یوں کی ہے: "جس طرح بے وضو نماز پڑھنا جائز نہیں ہے اسی طرح قرآن مجید کو ہاتھ لگانا بھی جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ غلاف کے اندر ہو تو ہاتھ لگایا جاسکتا ہے۔ غلاف سے مراد بعض فقہاء کے نزدیک جلد ہے اور بعض کے نزدیک وہ خریطہ یا لفافہ یا جُزء دان ہے جس کے اندر قرآن رکھا جاتا ہے اور اس میں سے نکالا بھی جاسکتا ہے۔ اسی طرح تفسیر کی کتابوں کو بھی بے وضو ہاتھ نہ لگانا چاہیے، کسی ایسی چیز کو جس میں قرآن کی کوئی آیت لکھی ہوئی ہو۔ البتہ فقہ کی کتابوں کو ہاتھ لگایا جاسکتا ہے اگرچہ مستحب یہی ہے کہ ان کو بھی بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے، کیونکہ ان میں بھی آیات قرآنی بطور استدلال درج ہوتی ہیں۔ بعض فقہائے حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ مصحف کے صرف اُس حصے کو بے وضو ہاتھ لگانا درست نہیں ہے جہاں قرآن کی عبارت لکھی ہوئی ہو، باقی رہے حواشی تو خواہ وہ سادہ ہوں یا ان میں بطور تشریح کچھ لکھا ہوا ہو، ان کو ہاتھ لگانے میں مضائقہ نہیں۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ حواشی بھی مصحف ہی کا ایک حصہ ہیں اور ان کو ہاتھ لگانا مصحف ہی کو ہاتھ لگانا ہے۔ رہا قرآن پڑھنا، تو وہ وضو کے بغیر جائز ہے"۔ فتاویٰ عالمگیری میں بچوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے قرآن مجید بچوں کے ہاتھ میں دیا جاسکتا ہے خواہ وہ وضو سے ہوں یا بے وضو۔

تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۸۰﴾ أَفِيْهِذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ
مُدْهِنُونَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكْذِبُونَ ﴿۸۲﴾

یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو، اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟

مسک شافعی کو امام نووی نے المنہاج میں اس طرح بیان کیا ہے: "نماز اور طواف کی طرح مصحف کو ہاتھ لگانا اور اس کے کسی ورق کو چھونا بھی وضو کے بغیر حرام ہے۔ اسی طرح قرآن کی جلد کو چھونا بھی ممنوع ہے۔ اور اگر قرآن کسی خریطے، غلات یا صندوق میں ہو، یا درس قرآن کے لیے اس کا کوئی حصہ تختی پر لکھا ہوا ہو تو اس کو بھی ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ البتہ قرآن کسی کے سامان میں رکھا ہو، یا تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہوا ہو، یا کسی سکہ میں اس کا کوئی حصہ درج ہو تو اسے ہاتھ لگانا حلال ہے۔ پتھر اگر بے وضو ہو تو وہ بھی قرآن کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اور بے وضو آدمی اگر قرآن پڑھے تو لکڑی یا کسی اور چیز سے وہ اس کا ورق پلٹ سکتا ہے۔"

مالکیہ کا مسلک جو الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں نقل کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے ساتھ وہ اس امر میں متفق ہیں کہ مصحف کو ہاتھ لگانے کے لیے وضو شرط ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم کے لیے وہ استاد اور شاگرد دونوں کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ بلکہ مائتہ عورت کے لیے بھی وہ بغرض تعلیم مصحف کو ہاتھ لگانا جائز قرار دیتے ہیں۔ ابن قدامہ نے الحنفی میں امام مالک کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جنابت کی حالت میں تو قرآن پڑھنا ممنوع ہے، مگر حیض کی حالت میں عورت کو قرآن پڑھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ایک طویل مدت تک اگر ہم اسے قرآن پڑھنے سے روکیں گے تو وہ بھول جائے گی۔

حنبل مذہب کے احکام جو ابن قدامہ نے نقل کیے ہیں یہ ہیں کہ جنابت کی حالت میں اور حیض و نفاس کی حالت میں قرآن یا اس کی کسی پوری آیت کو پڑھنا جائز نہیں ہے، البتہ بسم اللہ، الحمد للہ وغیرہ کنا جائز ہے، کیونکہ اگرچہ یہ بھی کسی نہ کسی آیت کے اجزاء ہیں، مگر ان سے تلاوت قرآن مقصود نہیں ہوتی۔ ہا قرآن کو ہاتھ لگانا، تو وہ کسی حال میں وضو کے بغیر جائز نہیں، البتہ قرآن کی کوئی آیت کسی خط یا فقہ کی کسی کتاب، یا کسی اور تحریر کے سلسلے میں درج ہو تو اسے ہاتھ لگانا ممنوع نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن اگر کسی چیز میں رکھا ہوا ہو تو اسے وضو کے بغیر اٹھایا جاسکتا ہے۔ تفسیر کی کتابوں کو ہاتھ لگانے کے لیے بھی وضو شرط نہیں ہے۔ نیز بے وضو آدمی کو اگر کسی فوری ضرورت کے لیے قرآن کو ہاتھ لگانا پڑے تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔ الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں مسک حنبلی کا یہ مسئلہ بھی درج ہے کہ بچوں کے لیے تعلیم کی غرض سے بھی وضو کے بغیر قرآن کو ہاتھ لگانا درست نہیں ہے اور یہ ان کے سرپرستوں کا فرض ہے کہ وہ قرآن ان کے ہاتھ میں دینے سے پہلے انہیں وضو کرائیں۔

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ۙ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ۗ ۙ
 وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ۙ ۙ فَلَوْلَا إِنْ
 كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۙ ۙ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۙ ۙ
 فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۙ ۙ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ
 نَعِيمٍ ۙ ۙ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۙ ۙ فَسَلَامٌ لَكَ مِنْ
 أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۙ ۙ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ ۙ ۙ

اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں پتھے ہو، تو جب مرنے والے کی جان حلق
 تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اُس وقت اُس کی نکلتی ہوئی
 جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اُس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اُس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں
 مگر تم کو نظر نہیں آتے۔ پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لیے راحت اور عذرا رزق
 اور نعمت بھری جنت ہے۔ اور اگر وہ اصحابِ یمن میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ
 سلام ہے تجھے، تو اصحابِ الیمین میں سے ہے۔ اور اگر وہ مجھلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو

ظاہر یہ کامسک یہ ہے کہ قرآن پڑھنا اور اس کو ہاتھ لگانا ہر حال میں جائز ہے خواہ آدمی بے وضو ہو یا جنتا
 کی حالت میں ہو، یا عورت حیض کی حالت میں ہو۔ ابنِ خزیمہ نے المصنوع (جلد اول، صفحہ ۷۷ تا ۸۲) میں اس مسئلے پر
 مفصل بحث کی ہے جس میں انہوں نے اس مسک کی صحت کے دلائل دیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ فقہاء نے قرآن
 پڑھنے اور اُس کو ہاتھ لگانے کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی قرآن و سنت سے ثابت نہیں ہے۔

۵۶۰ اصل الفاظ ہیں أَنْتُمْ تَهْتَكُونَهُنَّ - اِدْهَكُنْ کے معنی ہیں کسی چیز سے براہنت برتنا۔ اس کو اہمیت نہ دینا۔
 اس کو سنجیدہ تو ہر کے قابل نہ سمجھنا۔ انگریزی میں (To take lightly) کے الفاظ اس مفہوم سے قریب تر ہیں۔

۵۶۱ امام رازی نے تَجْعَلُونَ يَذَقُّكُمْ کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں لفظ رزق معاش کے
 معنی میں ہو چھوڑنا کہ کفار قریش قرآن کی دعوت کو اپنے معاشی مفاد کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہ

فَنَزَّلْنَا مِنْ حَبِيبٍ ۙ ۙ وَتَصْلِيَةً جَجِيمٍ ۙ ۙ إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقٌّ
الْيَقِينِ ۙ ۙ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۙ ۙ

تو اس کی تواضع کے لیے کھولنا ہوا پانی ہے اور جہنم میں جھوٹکا جانا۔

یہ سب کچھ قطعی حق ہے، پس اسے نبیؐ اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ ع

دعوت اگر کامیاب ہو گئی تو ہمارا رزق مارا جائے گا، اس لیے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے اس قرآن کی تکذیب کو اپنے پیٹ کا دھندا بنا رکھا ہے۔ تمہارے نزدیک حق اور باطل کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اصل اہمیت تمہاری نگاہ میں روٹی کی ہے اور اس کی خاطر حق کی مخالفت کرتے اور باطل کا سہارا لینے میں تمہیں کوئی تاثر نہیں۔

۱۲۷ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو، یعنی رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ کہا کرو۔ اور جب آیت سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اسے اپنے سجدے میں رکھو، یعنی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ کہا کرو۔ مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن خببان، حاکم۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا جو طریقہ مقرر فرمایا ہے اس کے چھوٹے سے چھوٹے اجزاء تک قرآن پاک کے اشاروں سے ماخوذ ہیں۔